محمد رؤف
شعبہ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد

کلامِ حالی کے چند نو آبادیاتی تناظرات

Moulana Hali is one of the prominent writers and critics of colonial era. He, not only paved the path of hermeneutic style of expression theoretically but also practiced it; and his prescribed mode of litrary expression was quite in accordance with colonial discourse. This research paper highlights the colonial elements of his critical, creative and philosophical thoughts so that its colonial perspective may be understood and true interpretive mode could be brought forward.

جنگ آزادی سے یوم آزادی تک کا عرصہ ہماری تہذیبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے اس نوآبادیاتی ماضی میں یورپی کلامیے کی انتدابی عمل داریوں سے دیگر معاشرتی سرگرمیوں کی طرح علم و ادب کے ایوان بھی متاثر ہوئے۔ تاریخ میں کلامیاتی تغیرات کی کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں سے کچھ ''طاقت کے نظریے'' کی مرہونِ منت ہیں تو کچھ ''نظریے کی طاقت'' کا نتیجہ۔ ہمارے یہاں مذکورہ عہد میں برپا ہونے والا تغیر وتبدل موخرالذکر محرک کا زائیدہ تھا۔ ایسی صورت حال میں حاکم اور محکوم دونوں کے پاس اپنے اپنے دائرہ عمل میں کارفرمائی کے مختلف امکانات موجود ہوتے ہیں اور شطرنج کے مہروں کی طرح کوئی بھی امکانی چال اپنے مخصوص نتائج سامنے لاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک امکانی عمل داری کے ممکنہ حاصلات مولانا حالی کے تنقیدی وتخلیقی آثار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری اردو شعریات کی ضابطہ بندی میں ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کلی حیثیت مدنظر رکھی جائے تو اس مقدمے میں مجوزہ شعریاتی اصلاحات اپنی نوعیت میں تخلیقی کم اور تکنیکی یا فنی زیادہ ہیں، تاہم روایتی طرز اظہار پر مولانا کی تنقیدی آراء نے ہمارے نامی گرامی غزل گو شعراء کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا گیا اور یوں ہمارے صدیوں پرانے ثقافتی خزینوں کی آئینہ دار یہ صنفِ شعر معاصر حالات سے مبینہ عدم مطابقت کی بنا پر قابلِ گردن زدنی قرار پائی۔ درحقیقت یہ ادبی سانحہ نوآبادیاتی دور کے مقتدر کلامیے کی پیداوار تھا۔ استعمار کار غزل کے رمزیہ اسلوب سے خائف ہوکر اسے یک سطحی اظہار کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ نیچرل شاعری کی ترویج اور مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی بے پناہ سماجی پزیرائی کا ایک اہم محرک نوآبادیاتی کلامیہ بھی تھا۔ سوال یہ ہے کہ ترویج اور مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی بے پناہ سماجی پزیرائی کا ایک اہم محرک نوآبادیاتی کلامیہ بھی تھا۔ سوال یہ ہے کہ نیچرل شاعری کی تحریک بہ جا سہی مگر اسی ضمن میں استعماری معبدوں کو غزل کا بلیدان لینا ہی کیوں مرغوبِ خاطر تھا؟ وجہ یہ ہے کہ اس صنفِ سخن میں کارفرما عشق و عاشقی کا مرکزی معنیاتی تفاعل ایک ایسا باطنی عمل ہے جو اخلاص، آزادی اور بے باکی جیسے خواص سے ترتیب پاتا اور مزاحمتی سرگرمیوں کی نشوونما و ارتقا کا سامان کرتا ہے۔ حیاتیاتی لفظیات میں عشق و عاشقی کے تعاملات کو اس صنف کا DNA قرار دیا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی مثنوی ''معاملاتِ عشق'' میں اس جذبے کو ''مظہرالعجائب'' قرار دیا ہے اور اسی تناظر میں شعرا نے اسے جذبِ حسینؑ، دمِ جبرائیلؑ، خدا کا رسولؐ اور حتی کہ خدا تک

کہا ہے۔ صنفِ غزل میں ایک ایسا ذہنی رویہ کارفرما ہوتا ہے جو استحصالی فضا میں استعماری قوتوں سے پر امن بقائے باہمی کا معاملہ روا نہیں رکھ سکتا۔ یہ نظامِ فکر ہمارے صدیوں کے پروردہ اجتماعی لاشعور کا ماحصل ہے۔ غزل میں ''غیر'' یا ''رقیب'' سے صلح جوئی کی منطق نکالنا اور ''زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز'' کی غیر مشروط تبلیغ کرنا استعماری نظام کی ہم نوائی کے مصداق ہے۔ اس ضمن میں سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

''پاک و ہند میں مسلمانوں کی تہذیب کی بنیاد ہی عشق اور جہاد پر ہے۔ مگر عشق اور جہاد دو الگ الگ رویّے نہیں، ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ مجاہد اور عاشق دونوں راضی بہ رضا ہتھیلی پر سر لیے پھرتے ہیں'' (۱)

اپنے اس مقدمے سے حالی دراصل غزل میں معاشرتی معاملات کی مرکزیت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بلا شبہ ان کی یہ اصلاحات جزوی طور پر برحق بھی ہیں اور استدلالی پیش کش کے بہ موجب متاثر کن بھی البتہ فنونِ لطیفہ اس نوع کی شعوری کاوشوں کے بہ مشکل ہی متحمل ہو پاتے ہیں۔ اس ضمن میں شمیم حنفی کا یہ فرمان بہت بلیغ ہے کہ:

''اجتماعی فن کا مہلک ترین پہلو یہ ہے کہ اس کی صورت گری تخلیقی قوتوں کی بجائے طے شدہ فارمولوں کی مدد سے کی جاتی ہے اور یہ فارمولے شاعر کی انفرادی استعداد سے زیادہ اجتماعی تقاضوں اور سطحی شعور کے پابند ہوتے ہیں۔ نتیجتاً فن جنسِ بازار اور عام مذاقِ طبع کا غلام بن جاتا ہے'' (۲)

امر واقعہ یہ ہے کہ حالی اپنے تمام تر فنی خلوص کے باوجود اسی مقتدر کلامیے سے متاثر تھے جسے استعماری قوتوں نے بڑے پر اسرار طریقے سے ہر طرف پھیلا رکھا تھا۔ یہ اسی کلامیے کا سحر ہے کہ مدرسہ حسین بخش (جہاں کے لوگ انگریزی مدرسوں کو ''مچھلے'' کہتے تھے) (۳) میں زیر تعلیم رہنے والے حالی جب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں مترجم بنے تو انھیں فوراً:

''انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص طور پر عام فارسی لٹریچر کی وقعت (ان کے) دل سے کم ہونے لگی'' (۴)

آخر ساحرانِ فرنگ ایسے خام کار بھی نہ تھے کہ محکوم قوم کو اپنے حاضر و موجود سے بیزار کرنے کے لیے کچا ٹوٹکا استعمال کریں۔ خود ترحّمی اور شرق بیزاری کی یہ وہی حالت ہے جس کے آثار علی گڑھ تحریک کے اکثر افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ابو الکلام قاسمی بہ جا طور پر لکھتے ہیں:

''حالؔی بھی جس طرح پیرویٔ مغرب کو اردو شاعری، اور نئی معیار بندی کا پیمانہ بنا کر پیش کرتے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر امپیریل ایجنڈا کی تکمیل میں تعاون دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔'' (۵)

دراصل حالی مغربی لٹریچر کے سحر میں آ کر مقامی شعریات کی صدیوں پرانی تاریخ سے انصاف نہیں کر پا رہے تھے۔ انھوں نے ملٹن کے سادگی، اصلیت اور جوش والے نظریۂ شعر کو اپنی فکر کا محور بنا کر اس حقیقت سے کسی حد تک صرفِ نظر کیا کہ مشرقی شعریات میں متن کی استعاراتی زبان کا تصور بہت پرانا ہے۔ موجودہ دور کا ایک اہم ناقد اس طرزِ فکر کو ''حالی کے جدید شعور کی یک جہتی'' (۶) قرار دیتا ہے۔ یوں تو ابتدا ہی سے مقدمۂ حالی پر ''لے دے'' ہوتی رہی (۷) مگر فی زمانہ ایسے لگتا ہے جیسے ہر نقاد اس سلسلے میں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اس کی ایک معقول وجہ شاید یہ ہے کہ آج ہم

سوسال سے زائد عرصے کی معروضی دوری بنا کر نو آبادیاتی دور کی سرگرمیوں کا زیادہ بہتر تجزیہ پیش کر سکتے ہیں۔ یوں بھی مشرق کی شعریاتی تاریخ میں عربی ، فارسی یا سنسکرت وغیرہ جیسی کسی بھی زبان میں مقدمۂ حالی کی طرز پر تخلیقی تفاعل کو تنقیدی افکار کے تابع کرنے کی ایسی منظّم نظری و عملی کاوش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ حالی کی کارگاہِ فکر میں ڈھلنے والی یہ شعریات مغربی ساخت کے فکری خمیر کا ثمرہ تھی جسے لاشعوری سرحدوں میں رہتے ہوئے مشرق کی سازگار فضاؤں میں نمو پا کر جدیدیت کے برگ و بار پیدا کرنا تھے۔ انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم پر ایسے ہی جدید طرز اظہار کے اس نو متعارفہ آئین کی مکمل پاس داری کی جاتی تھی لہٰذا شعر میں صداقت ، مبالغے سے پرہیز ، اصلیت کی پاس داری اور خیال کی سادگی کے مغربی تصورات روبہ عمل آنے لگے۔ حالی نے جدید شعری فضا میں بھر پور حصہ لیا اور محمد حسین آزاد کے ان لیکچروں کی پوری حمایت کی جو انجمن کے پلیٹ فارم پر کلاسیکل اردو شاعری میں کذب و ریا اور مبالغہ آرائی جیسی ''خامیوں'' کے خلاف ایک استغاثے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔آگے چل کر حاؔلی کا یہی فکر و عمل مقدمۂ شعر و شاعری کی صورت میں سامنے آیا جو فی الاصل اسی مقتدر کلامیے سے ہم آہنگ تھا جس نے مشرقی جمالیات کو نئے پیراڈائم میں لانے کی کوشش کی۔ اس کلامیے کا اصل مقصد ہندوستان کے آئیڈیالوجیکل سٹیٹ اپریٹس پر اجارہ داری قائم کر کے نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کے لیے فضا ساز گار بنانا تھا۔ اسی وجہ سے انجمن پنجاب کی نیچرل شاعری سے لے کر مقدمۂ حالی کی نظری اور عملی سرگرمیوں تک ہر جگہ رمز و استعارہ کی حاکمیت ختم کرنے کا تاثر ابھرتا ہے۔ حاکمانِ وقت جانتے تھے کہ زبان کے تہہ در تہہ ساختیاتی نظام ، کوڈز اور کنونشنز میں استعاراتی ابلاغ کی ایسی قوت ہوتی ہے جس پر ان کی اجارہ داری قائم ہونا ممکن نہیں ۔ ایسے میں صنفِ غزل یا دیگر اصناف کا رمزیہ پیرائیہ اظہار کیوں کر عتاب شاہی سے مامون رہتا؟ اس تناظر میں دیکھیں تو یہ مقدمہ دراصل برطانوی استعمار کی طرف سے بالخصوص اردو غزل اور بالعموم دیگر رمزیہ اصناف کے خلاف ایک ایسا ہی ایک حملہ ہے جس کا مقصد صنفِ غزل کو متخیلہ سے نکال کر ممیّزہ (نقلی) قوتوں کے تابع کرنا تھا تاکہ اس کی متنی تشکیل کسی مزاحمتی کلامیے کی محفوظ پناہ گاہ نہ بن پائے۔ اسی مقدمے کی جدید شعریاتی سفارشات صنفِ غزل کو اس کے اساسی طرز اظہار یعنی عشقیہ بیانیے (Erotic Expression) سے ہٹا کر ترجمانیِ احوال (Hermeneutic Expression) پر لانے کا ایک حربہ تھیں جب کہ روایتی صورت حال یہ ہے کہ عشقیہ اسلوب بیان کو تاریخِ ادبیات میں مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی یہ اسلوب ادبی دنیا کا اقتضا ہے ؛ جیسا کہ رضی مجتبیٰ ایک معروف مغربی ناقد سوزن سونٹیگ کا احوالہ نقل کرتے ہیں کہ :

"In place of hermenutics we need an erotics of art." (8)

الغرض غزل کا بنیادی سروکار سماجی حقیقتوں کو عشقیہ نوعیت کی جمالیاتی ساخت عطا کرنا ہے۔ اگرچہ حالی کی اس پیوند کاری سے صنفِ غزل کی شاخ فکر پر وہ اکھوا پھوٹا جس نے نمو پا کر فکر و خیال کی ایسی رنگا رنگ گل کاریاں کیں کہ چمنِ معنی میں بہار آ گئی، مگر سرِ دست مولانا حالی کے پورے خلوص کے باوجود اس کا اساسی جذبۂ محرکہ نو آبادیاتی مفاد تھا۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی؟ اس بات کا جواب حالی کی جدید غزل میں بھی ہے اور انجمن کے پلیٹ فارم پر برپا ہونے والے بہ مشکل دس مناظموں میں بھی۔ تاہم دوسری طرف مقدمے کی جدید شعریات کا اجتہادی اور افادی پہلو اس قدر اہم تھا کہ مخالفین کے تنقیدی حملے اس کی ناقدانہ اہمیت زائل نہیں کر پائے۔ آج بھی ہر تنقیدی کام کا حرف آغاز مقدمۂ حالی ہی بنتا ہے۔ مزید برآں اسی مقدمے کی بہ دولت حاؔلی کو پہلا باقاعدہ عمرانی نقاد بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ (۹) ڈاکٹر شمس الدین

صدیقی لکھتے ہیں: ''یہ حالی ہی کا اثر تھا کہ ان کے ہم عصر شعرا نے اردو شاعری کو سماجی زندگی کے سارے میلانات کا آئینہ بنا دیا''(۱۰)۔ حالی نے اپنی جدید شعریات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے مغربی اثرات کا بہت کھل کر اظہار کیا ہے:

حالیؔ ! اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں

بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے (۱۱)

اس تقلیدی روش سے قبل موصوف کی شاعری اپنے فن کی بلندیوں پر تھی مگر اس تبدیلی کے بعد ان کی کارگاہِ فکر میں اس قماش کے اشعار ڈھلنے لگتے ہیں:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ

مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ (۱۲)

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر

ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر (۱۳)

حالیؔ کی یہ غزلیں بہ ظاہر منظوم کلام تو ہیں مگر خدا لگتی یہ ہے کہ ان میں شعریت نام کی کوئی چیز نہیں۔ ناقدین نے اس طرز کلام کو سپاٹ، (۱۴) بے کیف و بے نمک،(۱۵) سطحی،(۱۶) بے رنگ(۱۷) اور جانے کیا کیا کہا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ اشعار دراصل کوئی سی چھ جدید غزلوں کے مطلع ہیں جو اس نوع کے بقیہ ''کلام موزوں'' کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ مولانا خود بھی اس کلام میں کسی شعریت کا زعم نہیں رکھتے تھے:

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالیؔ

الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ (۱۸)

اصل میں تخلیقی سرگرمیوں کو قومیانے یا سیاسیانے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس میں خیال خام کی فراوانی تو ہوتی ہے مگر پختہ تخلیقی سانچے بہ مشکل ہاتھ لگتے ہیں۔ یہ وہی حالی ہیں جو بزمِ احباب میں تماشائیوں کے ساتھ ساتھ اہل نظر کی موجودگی کا ادراک کرتے ہوئے ''اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی'' کے دستور العمل کا پرچار کرتے تھے۔ حالی کا یہ روکھا پھیکا کلام اپنے تاریخی تناظر میں بعض پہلوؤں سے اہم بھی ہے۔ ان کا مقدمۂ شعروشاعری اگر اقلیم سخن کا جدید نظری منشور تھا تو اس کلام سے انھوں نے اپنے ہی مرتب کردہ ضابطۂ سخن پروری کو عملی بنیادیں فراہم کی تھیں۔

مولانا لاہور آئے تو یہاں انگریزوں کے سرپرستی میں قائم ہونے والی ''انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب'' کے سرگرم رکن بن گئے۔ یہ انجمن بہ ظاہر مشرقی علوم کے احیا اور فروغ کے لیے سرگرم تھی مگر اس کا اصل مشن نوآبادیاتی نظامِ فکر کی تشکیل و ترقی تھا۔ اس انجمن کے پلیٹ فارم سے ایسا تخلیقی مواد شائع کیا جاتا تھا جو مشرق و مغرب کے ان سیاسی و سماجی گوشوں کی ترجمانی کرے جن سے مقتدر قوتیں ''مطالبِ مفیدہ'' کشید کر سکیں یعنی اہل مغرب کے محاسن اور اہل مشرق کے معائب کا پرچار ہو۔ نشانِ خاطر رہے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کے نفاذ اور ذریعہ تعلیم بنانے کی لارڈ میکالے پالیسی کے برعکس انجمن پنجاب کے کارپرداز مقامی زبانوں کو زیادہ مفید مطلب گردانتے تھے تاہم ان دونوں باہم معکوس نظریات میں استعماری زاویۂ نظر یعنی افادیت پسندی قدر مشترک ہے۔ مثال کے طور پر انجمن کے ایک جلسے میں حالی نے

اپنی نظم ''حبِّ وطن'' پیش کی جس میں اہلِ ہند کی نکبت و افلاس کو نوآبادکاروں کے استحصالی ہتھ کنڈوں کے بہ جائے مقامی افراد کی باہمی لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور یہی نہیں بل کہ مقتدر قوتوں کو انعام الٰہی گردانتے ہوئے لوگوں کی دل جمعی کی ضمانت فراہم کی گئی ہے:

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام
کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام(۱۹)

نوآبادیاتی دور کے اس ''قلزمِ خوں کا ایک شناور'' غالبؔ بھی تھا جو اپنے تمام تر مادی طرزِ عمل کے باوجود اپنی شعری حسّیات کو انفرادی اثرات سے متاثر نہیں ہونے دیتا اور اپنی نوآبادیاتی پوزیشن یوں واضح کرتا ہے۔

مجبوری و دعواے گرفتاری الفت
دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے (۲۰)

اس سے مترشح ہے کہ ہماری مملکت ایقان پر مغربی فکر و فلسفہ کا واضح نقش عہد حالی کی یادگار ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر محمودالرحمٰن کا یہ کہنا کہ '' حالی کا نقطۂ نظر مفاہمت اور مسلک مادیت کی طرف تھا''(۲۱) صائب نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں حالی کی معروف نظم ''مدّ وجذر اسلام'' کا فکری نظام بھی قابل غور ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا رشتہ جذبۂ ایمانی ــــــ جو اپنے اندر طبعی انقلاب کا بھی پورا سامان رکھتا ہے ــــــ کے ترفع سے نہیں بل کہ محض طبعی علوم سے تعلق یا لاتعلقی سے جوڑا گیا ہے۔ مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں پیش کردہ یہ نظام فکر عقلیت کی حرکیات (Dynamics of Rationalism) کا مثیل ہے۔ یہ فلسفہ درحقیقت انفس و آفاق میں دوئی کا پیش خیمہ ہے اور اسے نوآبادیاتی سیاست کے ایک آئیڈیالوجیکل سٹیٹ اپریٹس کے طور پر بھی روبہ عمل لایا جاتا رہا ہے۔ اسی فلسفے کی کارفرمائی کا ایک پہلو اس نظم کے نعتیہ اشعار میں پیش کردہ تصور انسان سے بھی مترشح ہے۔ یہاں رسول اکرمؐ کی جو تعریف ''خطا کار سے درگزر کرنے والا/ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا'' جیسی اخلاقی صفات سے متعین کی گئی ہے، بلاشبہ درست ہونے کے باوجود مدحتِ رسولؐ کی عمومی نہج سے ہم آہنگ اور نعت گوئی کے اس روایتی زاویۂ ارتفاع کی حامل نہیں جو عقلیت پرستی اور افادیت پسندی کے فروغ سے قبل اس صنفِ سخن کے لیے مخصوص تھا۔ صنفِ نعت کے بعض ناقدین اسے ''سیکولر نعت'' کا نام دیتے ہیں۔ محمد حسن عسکری جو نعت کی روایتی شعریات کے حامی اور نظامِ اسلام میں اخلاقیات کو ایمان ، عقیدے اور عبادت کے بعد چوتھے درجے کی چیز گردانتے تھے ،حالی کی اس طرزِ مدحت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''خیر اتنا کام تو خود مولانا حالی بھی کر لیتے ہوں گے'' (۲۲)۔ درحقیقت نعت میں یہ تصور انسانی ___ لاشوری طور پر ہی ___ پیرویٔ مغربی کا نتیجہ ، عقل پرستی سے مربوط اور جدیدیت کے کلیدی مقدمے یعنی انسان پرستی (Humanism) کی منطقی قبولیت کو ممکن بنا رہا تھا۔ انسان پرستی کی بنیادی بصیرت یہی ہے کہ عروج و زوال کا واحد معیار انسانی عقل اور اس کے نتیجے میں تشکیل پانے والی تجربی سائنس ہے نہ کہ وحی یا انسان کی ذات سے منسلک کوئی اور ماورائی صفت۔ واضح رہے کہ فی زمانہ جدیدیت کو عموماً عیسائیت مخالف تحریک سمجھا جاتا ہے جب کہ درحقیقت یہ ہر الہامی مذہب کے علی الرغم اپنی مخصوص اخلاقیات ، ایک جداگانہ تصور کائنات اور غیر روایتی تصور انسان رکھتی ہے۔ اس ضمن میں مارگریٹ مارکس (موجودہ نام مریم جمیلہ) لکھتی ہیں:

"Modernism is a militant revolt against religion and spirtual values it represents. This revolt had its seeds in the European Renaissance" (23)

اگرچہ مولانا حالی کے ہاں اس مسدس کے علاوہ کچھ اور نعتیہ کلام بھی ملتا ہے جس میں بشری اور انسانی جہت کے ساتھ ساتھ حضورؐ کی ماورائی اور نوری جہت کو بھی بیان کیا گیا ہے مگر ایسا کلام سرسید کے حلقۂ ارادت میں آنے اور پیرویٔ مغرب اختیار کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اگرچہ مسدس حالی کی موضوعی قدر نعتیہ نہیں بل کہ سماجی نوعیت کی ہے او یوں اس میں ضمناً در آنے والے نعتیہ بند کا رعایت مضمون کے حوالے سے بشریت اور عبدیت مائل ہونا منطقی لگتا ہے مگر اس میں نبی اکرمؐ کی زبان سے ''بندگی'' اور'' بے چارگی'' کا جو اعتراف کروایا گیا ہے اس کا محل نظر ٹھہرنا بھی غیر منطقی نہیں (۲۴)۔ اس وسیع سیاق کے ضمن میں جمال پانی پتی اپنا تجزیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا حالی کی فنی پختگی ، خلوصِ نیت اور دردمندی بہ جا مگر جو ناقدین اس نعتیہ بند کو اردو نعت نگاری کی پوری روایت پر حاوی قرار دیتے ہیں انھیں نفسِ مضمون کی یہ نزاکت بھی مدنظر رکھی چاہیے کہ جہاں مدحتِ رسولؐ کو الوہیت سے ہم کنار کرنا شرک ہے وہاں آپ کو بشریت کی بالکل عمومی سطح پر لانا بھی نعت گوئی کی شعریات سے دوری بل کہ اپنے ایمان کو معرضِ خطر میں ڈالنے کے مترادف ہے(۲۳)۔ واضح رہے کہ نوآبادیاتی سماج میں علم اور جہالت کی جدلیات کا محرک فی الاصل غیر محسوس طریقے سے مقتدر کلامیے کا وہ انتدابی عمل ہوتا ہے جو محکوم طبقے کے روایتی اور مرتب و مربوط نظامِ فکر میں لچک پیدا کرتا اور پھر اسے بتدریج بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی عمل کے نتیجے میں آگے چل کر نبی اکرمؐ کو'' محمد صاحب''، '' پیغمبر صاحب''، ''ایک بڑے ریفارمر'' جیسے القابات سے یاد کیا جاتا رہا حتیٰ کہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ'' اہل نظر'' نے ثبوتِ حق کے لیے ''اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی'' کے اعلامیے جاری کرنا شروع کر دیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے مغربی فکر و فلسفہ سے خوشہ چینی پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''حکمت واقعی مومن کا گم شدہ ورثہ ہے لیکن گم شدہ ورثے کے بھیس میں فکر کی چرس درآمد کرنا یقیناً قابلِ نفرین حرکت ہے''(۲۵)

کلام حالی کے اس مخصوص تناظر میں عمران شاہد بھنڈر کا یہ تجزیہ بڑا معنی خیز ہے:

''جہالت علم سے باہر کوئی شے نہیں جو اس کی مخالف سمت میں چلتی ہے اور جسے علم کے ذریعے تلاش کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔ جہالت علمی خیالات کی ترتیب و تنظیم کے وضع کردہ معیار اور اصولوں سے جنم لینے

والے تضادات کا اظہار یعنی علمی طریقہ کار (Method) میں مضمر نقص کا نام ہے۔ یہ نقص جدید مغربی فکر و فلسفہ میں تشکیل پاتا ہوا ان کے تعلیمی طریق کار کا حصہ بن چکا ہے۔'' (۲۶)

الغرض نوآبادیاتی دور ہمارے نظام خیال میں کچھ ایسے عناصر کے تداخل کا باعث بنا جس سے مشرقی فکر و فلسفے کا تانا بانا بری طرح گنجلک ہوگیا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے نوآبادیاتی سرمائے کا بھرپور جائزہ لیں اور اس کے حسن و قبائح نشان زد کریں۔ نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندوں کے مابین ہمہ جہتی تعاملات اس دور کی تخلیقی بساط پر بالکل واضح ہیں لہٰذا بہ قول حالی:

؎ حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ایک یہی فتح و ظفر کی صورت (۲۷)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سجاد باقر رضوی: معروضات، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، س۔ن، ص۵۹

۲۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص۱۹

۳۔ حاؔلی، الطاف حسین، مولانا: ''حالی کے خودنوشت حالات''، مشمولہ: حالی کا نظریۂ شعری، پیش کار، ناظر کاکوروی، الہ آباد، ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص۱۷

۴۔ ناظر کاکوروی: حالی کا نظریۂ شعری، ص۲۱

۵۔ ابوالکلام قاسمی: معاصر تنقیدی رویے، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۷ء، ص۰۷

۶۔ شمیم حنفی: جدیدیت اور نئی شاعری، ص۱۸

۷۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر: اردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س۔ن، ص۱۴۶

۸۔ رضی مجتبیٰ: جدیدادب کا تناظر، کراچی: بازیافت، ۲۰۱۴ء، ص ۳۴۵

۹۔ ضیاء الحسن ڈاکٹر: اردو تنقید کا عمرانی دبستان، ص ۵۶

۱۰۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: ''ادبی منظر'' (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) مشمولہ: تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند، ج: ۹، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص۵۴

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: دیوان حالی، لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن، ص۱۴۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۴۔ وارث کرمانی، ڈاکٹر: ''جدید شعری تنقید''، مشمولہ: نقوش، لاہور، ش: ۱۵، ص۲۴

۱۵ رشید حسن خاں، مقدمہ: دیوانِ حالی، ص ۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۶

۱۷۔ ایضاً،ص ۷

۱۸۔ حالؔی، دیوان حالی،ص۲۸

۱۹۔ حالؔی :حبِ وطن (نظم)،مشمولہ: انجمن پنجاب کے مشاعرے ،مرتبہ: عارف ثاقب، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵، ص۲۱۴

۲۰۔ گپتا رضا، کالی داس (مرتب): دیوانِ غالب کامل ،کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء،ص۱۹۴

۲۱۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: جنگ آزادی کے اُردو شعرا، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ وثقافت،س۔ن، ص ۵۸۵

۲۲۔ محمد حسن عسکری: مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص۴۱۱

23. Maryam Jameelah: *Islam and Modernism*, Lahore, Yousaf Khan & Sons, 1965, p:61

۲۴۔ جمال پانی پتی: نفی سے اثبات تک ،کراچی: اکادمی بازیافت،۲۰۰۴ء،ص ۱۸

۲۵۔ تحسین فراقی: جستجو، لاہور: یونی ورسل بکس، ۱۹۸۷ء،ص۱۴

۲۶۔ عمران شاہد بھنڈر:''علم اور جہالت کی جدلیات'' (کالم)،مشمولہ: روزنامہ ایکسپریس ،فیصل آباد،۳۰ اکتوبر۲۰۱۴ء

۲۷۔ دیوان حالی ،ص ۸۷